اشفاق حسین
ٹورنٹو۔کینیڈا

جاوید اختر کا شعری سفر

ترکش سے لاوا تک

اردو کے مخصوص تو نہیں لیکن عمومی منظر نامے میں جاوید اختر صاحب اپنے پہلے مجموعے ''ترکش'' کا سرمایۂ شعر لیے کسی حد تک دیر سے داخل ہوئے تھے۔ اور وہ بھی اس وقت جب ان کے سر پر بالی وڈ کی شہرت والی رنگین کیپ سج چکی تھی۔ ایسے میں بساطِ ادب پر کچھ ہلچل سی ہوئی، کچھ سرگوشیاں بھی ہوئیں اور ادبی پنڈتوں نے پیشن گوئیاں کرنی شروع کر دیں کہ گویا یہ چمک دمک بھی بس سلور اسکرین پر چکا چوند کرتی ہوئی چند ساعتوں کی ہی مہمان ہے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کیوں کہ وہ تو اپنی تمام تر شہرت اور مقبولیت کے ساتھ اپنی خوب صورت شاعری کا ایک ایسا وزنی پتھر بھی اپنے ساتھ باندھ کر لائے تھے کہ آندھیاں تو بہت تیز چلیں مگر ان کے قدم نہیں اکھڑے۔ یوں ہے کہ ان کے پاؤں اور بھی مضبوطی کے ساتھ شاعری کے اس دشتِ بے کراں میں آج بھی گڑے ہوئے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ کسی ادبی تخلیق پر کہے ہوئے کسی نقاد کے جملے بار بار دہرائے جاتے تھے کہ اُس سے تخلیق کار کے اعتبار اور اس کے وزن اور وقار میں اضافہ ہو مگر اب تو یہ روایت بھی کافی کمزور پڑ چکی ہے۔ ایسے میں جب جاوید اختر کا پہلا مجموعہ قرۃ العین حیدر کے دیباچے اور گوپی چند نارنگ کے فلیپ کے ساتھ شائع ہوا تو ہوا کا رخ کچھ بدلا ہوا سا نظر آیا۔ اُن دونوں ہی معتبر ہستیوں نے ادبی چرچ کی گھنٹی بجاتے ہوئے بڑے مستقبل بیں لہجے میں کہا تھا کہ جاوید اختر کی آواز ان کی اپنی آواز ہے۔ اس آواز میں ایک تہذیبی شخصیت بول رہی ہے۔ یہ اپنے دور کے صنعتی معاشرے میں سانس لیتے ہوئے انسان کی آواز ہے۔ یہ اپنے عہد سے جڑی ہوئی بھی ہے اور اپنی تاب دار روایتوں کا عطر بھی کشید کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس آواز کو پوری توجہ اور غور سے سنا جانا چاہیے۔

ساعتوں کے تمام تر بحران کے باوجود خوشی اس بات کی ہے کہ اس آواز کو آج نہ صرف سنا جا رہا ہے بلکہ اس کے آہنگ میں چھپے ہوئے بھیدوں کو بھی سمجھنے کی سنجیدہ کوششیں ہو رہی ہیں۔

''ترکش'' کی اشاعت کے تقریباً پندرہ سولہ سال بعد جاوید اختر صاحب نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام ''لاوا'' کی اشاعت کا اہتمام کیا اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جب اردو شاعروں کی اکثریت وزیٹنگ کارڈز کی طرح سال بہ سال اپنے نئے شعری مجموعوں کی

اشاعت کے اہتمام میں ہمہ وقت مصروف نظر آتی ہے۔تو کیا ایک مجموعے سے دوسرے مجموعے کی اشاعت کا یہ طویل دورانیہ بھی اپنے اندر ایک انفرادیت نہیں رکھتا ؟ مجھے تو اس میں بھی جاوید صاحب کی انفرادیت کا ہی ایک پہلو نظر آتا ہے۔

جدھر جاتے ہیں سب جانا اُدھر اچھا نہیں لگتا
مجھے پامال رستوں کا سفر اچھا نہیں لگتا

اور فیض کی زمین میں ان کا یہ کہنا کہ

ہم کو تو بس تلاش نئے راستوں کی ہے
ہم ہیں مسافر ایسے جو منزل سے آئے ہیں

یہ جو منزل پر پہنچ جانے کے بعد پھر کسی نئے راستے کی تلاش کا عمل ہے یا ان کی طبیعت پامال رستوں کو جس طرح نظر انداز کرتی ہے تو یہیں سے ان کی انفرادیت کے پودے میں نئے نئے اکھوے پھوٹتے ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں ایسے حادثے آئے دن ہوتے رہتے ہیں کہ لکھنے والے انفرادیت اور محض نئے پن کی تلاش میں اُن طلسمی بیابانوں کی طرف نکل جاتے ہیں جہاں سے واپسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی اور اگر پلٹ کر دیکھتے بھی ہیں تو پتھر کے بن کر رہ جاتے ہیں۔ جاوید اختر صاحب زندگی میں بہت سے حادثوں سے دوچار ہوئے ہیں مگر اس طرح کا کوئی حادثہ ان کے ساتھ یقیناً نہیں پیش آیا۔ وہ زندہ انسانوں کے سنگ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور انہی کی طرح سوچتے ہیں' تفکر اور تعقل کی کھلی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں' اپنے پسندیدہ آرٹ کے میڈیم میں رہتے ہوئے زندگی کے چھوٹے موٹے سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی اتنی وسیع و عریض کائنات کے بارے میں چند اہم اور بنیادی سوالات اٹھانے کی جرات بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

میں کتنی صدیوں سے تک رہا ہوں
یہ کائنات اور اس کی وسعت
تمام حیرت تمام حیرت
یہ کیا تماشا یہ کیا سماں ہے
یہ کیا عیاں ہے
یہ کیا نہاں ہے
اتھاہ سا گر ہے اک خلا کا
نہ جانے کب سے

نہ جانے کب تک
کہاں تلک ہے
ہماری نظروں کی انتہا ہے
جسے سمجھتے ہیں ہم فلک ہے
یہ رات کا چھلنی چھلنی سا کالا آسماں ہے
کہ جس میں جگنو کی شکل میں بے شمار سورج پگھل رہے ہیں
شہابِ ثاقب ہیں یا ہمیشہ کی ٹھنڈی کالی فضاؤں میں
جیسے آگ کے تیر چل رہے ہیں
کرور ہا نوری برسوں کے فاصلوں میں پھیلی یہ کہکشائیں
خلا کو گھیرے ہیں
یا خلاؤں کی قید میں ہیں
یہ کون کس کو لیے چلا ہے
ہر ایک لمحہ کروروں میلوں کی جو مسافت ہے
ان کو آخر کہاں ہے جانا؟
اگر ہے ان کا کہیں کوئی آخری ٹھکانا
تو وہ کہاں ہے؟

یقیناً کسی انسانی ذہن میں پہلی بار ایسے سوالات نہیں اٹھے ہیں- بدلتی ہوئی شکلوں اور نئی نئی معلومات کے سائے تلے ہزار ہا صد ہزار صدیوں سے انسانی ذہن ان سوالوں کا مسکن بنا ہوا ہے- مذہبی، تاریخی، معاشرتی اور سائنسی غرض تمام ممکنہ علوم کے سہارے ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں- ظاہر ہے کہ ان سوالوں کے مکمل اور متجسس ذہن کو مطمئن کر دینے والے جوابات تو آج بھی تشنۂ تکمیل ہیں- تو کیا انسان اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں ایسے بنیادی سوالات قائم کرنا بالکل ہی چھوڑ دے؟ گویا یہ بھی ایک طرح کا سوال ہی تو ہے- جاوید اختر صاحب کو یقین ہے کہ انسانی ذہن ان سوالوں کے جوابات کبھی نہ کبھی ضرور ڈھونڈ لے گا- چنانچہ ایسے سوال کرنے والوں کو شک کی نظروں سے دیکھا جانا انہیں ہرگز قبول نہیں ہے- چاہے ایسے شکی لوگوں کا سلسلہ مذہبی دساتیر سے ملا ہو یا کسی اور مروجہ سماجی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہو وہ ان سب کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے اپنی اس نظم کا اختتام

اس طرح کرتے ہیں:

اگر کوئی واعظ اپنے منبر سے نخوت آمیز لہجے میں یہ کہے
تم کبھی سمجھ ہی نہیں سکو گے
کہ اس قدر ہے یہ بات گہری
تو کوئی پوچھے
جو میں نہ سمجھا تو کون سمجھے گا؟
اور جس کو کبھی نہ کوئی سمجھ سکے
تو ایسی بات تو پھر فضول ٹھہری

واعظوں، خطیبوں اور منبروں پر گرجنے برسنے اور اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھنے والوں سے جاوید اختر صاحب کے مکالمے ان کی شاعری ہی میں نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی جاری رہتے ہیں۔ یوٹیوب پر کچھ وقت ان کے ساتھ گزاریے تو ایسی اور بھی بہت سی پرتیں کھلیں گی۔

''لاوا'' میں ایسی کئی نظمیں ہیں جو ماڈرن ذہن میں اٹھنے والے سوالوں پر صاد کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں کے اس خاندان میں 'زبان' 'یہ کھیل کیا ہے' آنسو' 'آرزو کے مسافر' 'برگد' 'کچی بستی' 'بروقت ایک اور خیال' اور 'خدا حافظ' (پاکستانی ایڈیشن میں اس کا عنوان بدل کر اللہ حافظ بھی ہوسکتا ہے) جیسی روشن نظمیں شامل ہیں اور یہ نظمیں یقیناً توجہ اور غور سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ جاوید اختر صاحب کی شاعری جدید صنعتی معاشرے، بڑے بڑے شہروں کے سلمز اور مڈل کلاس لوگوں کے مسائل کے اردگرد گھومتی ہے۔ اس میں کسی حد تک سچائی ضرور ہے۔ ایسی نظمیں ان کے پہلے مجموعے 'ترکش' میں زیادہ نظر آتی ہیں مگر 'لاوا' میں بھی اس طرز کی نظمیں شامل ہیں۔ میرے خیال میں 'کچی بستی' والی نظم اس کی بہترین مثال ہے۔

گلیاں
اور گلیوں میں گلیاں
چھوٹے گھر ' نیچے دروازے
ٹاٹ کے پردے، میلی بدرنگی دیواریں
دیواروں سے سر ٹکراتی کوئی گالی

گلیوں کے سینوں پر بہتی گندی نالی
گلیوں کے ماتھے پر بہتا آوازوں کا گندہ نالا

نظم کی یہ ابتدائی لائنیں ایک پوری پینٹنگ کا سامنظر پیش کرتی ہیں-اس منظر میں داخل ہو جانے کے بعد پھر وہ ہمیں وہاں کے باسیوں کی کہانی سناتے ہیں- بہت چھوٹے چھوٹے جملوں میں' آسانی سے سمجھ میں آ جانے والے انداز میں اور بہت ٹھراؤ کے ساتھ- مگر نظم کی پنچ لائینیں ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہیں-

ساری بستی جیسے اک دکھتا پھوڑا ہے
یوں لگتا ہے ساری بستی جیسے ہے اک جلتا کڑھاؤ
یوں لگتا ہے جیسے خدا نکّو پر بیٹھا
ٹوٹے پھوٹے انساں
اونے پونے داموں بیچ رہا ہے

اب اگر اس انداز کی نظموں کو اردو کی جدید ترین ترقی پسند نظموں کے خانے میں نہ رکھا جائے تو پھر کہاں رکھا جائے؟

جاوید اختر صاحب نے اپنے پہلے مجموعے کی پہلی نظم میں اپنے گھر کے آنگن اور اس میں لگے ہوئے ایک بڑے درخت کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب میں چھوٹا تھا تو وہ آنگن میری ضرورتوں اور خواہشوں سے بہت بڑا تھا اور اس آنگن میں لگا ہوا پیڑ تو بہت ہی بڑا تھا- انہیں یقین تھا کہ جب وہ خود ذرا اور بڑے ہو جائیں گے تو اس پیڑ کی پھُننگی کو بھی چھو لیں گے- یہ یقین اور اعتماد اپنی جگہ پر لیکن برسوں بعد جب وہ اس گھر کے آنگن میں پہنچتے ہیں تو اس پیڑ کو دیکھتے ہی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

یہ آنگن کتنا چھوٹا ہے
پیڑ مگر پہلے سے بھی تھوڑا اونچا ہے

اس نظم کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر 'لاوا' کی شاعری کو پڑھا جائے تو ایسا ہی نتیجہ نکالنے میں آپ کو اور مجھے کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوگی کہ جاوید صاحب نے اپنی شاعری کے آنگن میں 'ترکش' کے عنوان سے جو پیڑ لگایا تھا اس کے اسالیب و بیان کا آنگن لاکھ چھوٹا سہی مگر 'لاوا' تک پہنچتے پہنچتے یہ پیڑ اور بھی اونچا ہو چکا ہے- آیئے ان کی شاعری کے اسی گھنے پیڑ کے سائے میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر کر ان کی غزلوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں-

جاوید اختر صاحب کی غزلوں میں جہاں ان کے اپنے ذاتی دکھوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں وہیں اپنے اردگرد ہونے والے حالات پر ایک دردمند دل کا نوحہ بھی سنائی دیتا ہے- لیکن یہ سب' کچھ اس طرح بیان ہوتا ہے کہ آنکھوں میں امید کے جلتے ہوئے

دیے بجھنے نہیں پاتے بلکہ ان کی چمک دمک میں اور بڑھاوا آ جاتا ہے' پگڈنڈیوں پر حوصلہ مندی کے جگنو جھلملانے لگتے ہیں اور ہونٹ اچھے دنوں کے خواب گنگنانے لگ جاتے ہیں-

بظاہر کیا ہے جو حاصل نہیں ہے
مگر یہ تو مری منزل نہیں ہے
یہ تو دا ریت کا ہے ' بیچ دریا
یہ بہہ جائے گا یہ ساحل نہیں ہے
بہت آسان ہے پہچان اس کی
اگر دکھتا نہیں تو دل نہیں ہے

اب تک زندہ رہنے کی ترکیب نہ آئی
تم آخر کس دنیا میں رہتے ہو بھائی

آرام دہ مکاں تھا مکیں با تمیز تھے
بس کھڑکیوں کے پردے بہت ہی دبیز تھے

نہ تو دم لیتی ہے تو اور نہ ہوا تھمتی ہے
زندگی زلف تری کوئی سنوارے کیسے

نہ کوئی عشق ہے باقی نہ کوئی پرچم ہے
لوگ دیوانے بھلا کس کے سبب سے ہوجائیں

میں کب سے کتنا ہوں تنہا تجھے پتا بھی نہیں
ترا تو کوئی خدا ہے مرا خدا بھی نہیں

ویسے تو غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہوا کرتا ہے لیکن اکثر غزل کے بہت سے اشعار مل کر بھی خود ایک اکائی بن جاتے ہیں- اسے غزل مسلسل کی ایک صورت بھی کہا جا سکتا ہے- 'لاوا' کی بیشتر غزلیں اسی کیفیت کے کجرے میں گندھی ہوئی ہیں جس سے ایک بھرپور اور دلوں کو متاثر کرنے والی فضا بنتی ہے - ایسی غزلوں میں ان کے جوہر خوب خوب کھلتے ہیں-

جاوید اختر صاحب ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں- اپنے زمانے اور اس سے پہلے کی شاعری پر ان کی گہری نظر ہے- اس کے نتیجے میں ان کے یہاں ہماری کلاسیکی بالخصوص غزل کی شاعری کی وہ تابناک روایت اپنی جھلک دکھلاتی ہے جسے چراغ سے چراغ جلانے کی

روایت کہتے ہیں- یہ مکھی پر مکھی بٹھانے کا عمل نہیں ہے بلکہ بات کو آگے بڑھانے' اسے نئے ڈھنگ سے کہنے یا اس کے مفہوم کو بالکل پلٹ دینے کا عمل ہے- غالب نے کہا تھا نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا مگر آج کے جدید معاشرے کا عام آدمی ایسے نہیں سوچتا- کوئی منصوبہ ہو' کوئی پروجیکٹ ہو یا کوئی مشترکہ لائحۂ عمل ہو وہ پلٹ کر پوچھتا ہے What is in it for me ? صارفیت کے اس میکنزم نے ہماری روایتی سوچ کو کتنا بدل ڈالا ہے- جاوید صاحب نے غالب کے اُس شعر کے مفہوم کو بالکل پلٹتے ہوئے کہا

یہ ستائش کی تمنا یہ صلے کی پروا
کہاں لے آئے یہ ارمان ذرا دیکھ تو لو

چراغ سے چراغ جلانے کی ایک اور جھلک سید عابد علی عابد کے اس خوب صورت شعر کو پڑھنے کے بعد دیکھیے:

وقتِ رخصت وہ چپ رہا لیکن
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

لیکن اس خوب صورت شعر کا سارا حسن اسی آنکھ تک محدود ہے جس میں کاجل پھیل رہا ہے- اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے جو اس منظر کو دیکھ رہا ہے- لیکن اسی بات کو ذرا سا آگے بڑھاتے ہوئے جاوید اختر صاحب نے اپنے شعر میں مزید خوب صورتی اور معنویت پیدا کر دی ہے-:

اُس کی آنکھوں میں بھی کاجل پھیل رہا ہے
میں بھی مڑ کے جاتے جاتے دیکھ رہا ہوں

تقسیمِ برصغیر کے فوراً بعد بھارت سے آئے ہوئے ایک مہمان شاعر نے جس کا تہذیبی پس منظر بتانے کی شاید ضرورت نہیں ہے کراچی میں منعقد ہونے والے کل ہند و پاک مشاعرے میں اپنے ایک شعر پر خوب داد پائی تھی-

غیرتِ اہلِ چمن کو کیا ہوا
چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا

اور تقسیم کے بعد بھارت میں اسی تہذیبی پس منظر میں جوان ہونے والی نسل کے نمائندہ شاعر جاوید اختر نے تقریباً آدھی صدی گزرنے کے بعد بڑے بانکپن اور اعتماد کے ساتھ کہا:

چھوڑ کر جس کو گئے تھے آپ کوئی اور تھا
اب میں کوئی اور ہوں واپس تو آ کر دیکھیے

یہی غزل کی ایمائیت اور اس کا حسن ہے- جاوید اختر صاحب اس حسن کے شیدا بھی ہیں اور اس کے خدمت گزاروں میں بھی

ہیں- میرے نزدیک 'لاوا' کی بیشتر غزلیں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں-

نگل گئے سب کی سب سمندر زمیں بچی اب کہیں نہیں ہے
بچاتے ہم اپنی جان جس میں وہ کشتی بھی اب کہیں نہیں ہے
تم اپنے قصبوں میں جا کے دیکھو وہاں بھی اب شہر ہی بسے ہیں
کہ ڈھونڈتے ہو جو زندگی تم وہ زندگی اب کہیں نہیں ہے

آج میں نے اپنا پھر سودا کیا
اور پھر میں دور سے دیکھا کیا
زندگی بھر میرے کام آئے اصول
ایک اک کر کے انہیں بیچا کیا

بہت سے فائدے ہیں مصلحت کے
مگر دل کی تو یہ مرضی نہیں ہے
ہر اک کی داستاں سنتے ہیں جیسے
کبھی ہم نے محبت کی نہیں ہے

قرۃالعین حیدر نے ترکش کے دیباچہ کی آخری سطر یہ کہتے ہوئے تقریباً نامکمل چھوڑ دی تھی کہ ''یہ جدید اردو شاعری کی ایک اہم دستاویز ہے جب تک جاوید کی دوسری کتاب چھپے'' اور پھر اس کے فوراً بعد انہوں نے کاغذ پر بہت سے ڈاٹس لگا دیے تھے- ایسا لگتا ہے جیسے وہ اُس سے اپنا جملہ کسی اور وقت کے لیے محفوظ رکھنا چاہتی ہوں کہ دیکھیں گنبدِ نیلوفری رنگ دکھاتا ہے کیا؟ اپنا یہ ادھورا جملہ مکمل کرنے کے لیے اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ''لاوا'' کی شاعری ان کے چھوڑے ہوئے ہر نقطے کو بڑی خوب صورتی سے بھرتی چلی گئی ہے- آج اگر وہ ہوتیں تو اس کتاب کی اشاعت پر جاوید اختر صاحب کو ڈھیروں مبارکباد دیتیں-